ڈاکٹر محمد طاہر ملک

استشراق کی تاریخ

لفظ "شرق" ایسا کلمہ ہے جو اگرچہ تقریباً دو ہزار سال پہلے سے علمی زبان میں مستعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا مفہوم غیر واضح اور اس کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا رہا ہے۔ کبھی "شرق" سے مراد مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے کچھ ممالک ہوتے ہیں اور کبھی یورپین کی نظر میں شرق کا استعمال ایشیا کے تمام حصوں پر (ماسوائے سائبیریا کے) ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر چین اور جاپان کو مشرق بعید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ یہ بات پھر بھی مختلف فیہ ہے کہ شرق اوسط اور شرق ادنٰے کا اطلاق کن ملکوں پر ہوتا ہے۔

شرق کا لفظ اصل میں اجرام فلکی کے مصطلحات میں سے ہے اور اس سے مراد وہ سمت ہے جدھر سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو اس شخص کے اعتبار سے جو "شرق" اور "غرب" کا لفظ بول رہا ہے زمین کا ہر حصہ ایک ہی وقت میں شرق اور غرب ہے۔ بہر حال براعظم ایشیا کو "شرق" اور یورپ کو "غرب" کہنے کا رواج یونانیوں کے زمانے میں پڑا، اس لیے کہ اس وقت یہ بات مسلّمہ طور پر مانی جاتی تھی کہ زمین چپٹی ہے اور اس طرح آبادی کے حصوں کی تحدید ہو جاتی تھی۔ ایشیا کو "شرق" اور یورپ کو "غرب" سے موسوم

کرنے کا پہلا ثبوت ہیروڈوٹس کی کتاب میں ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کے سلسلے میں ملتا ہے۔ یونانی تمام دیگر اقوام کو بربر اور جاہل سمجھتے تھے، باوجودیکہ ان کے وقائع نگار بعض اقوام مثلاً مصری، بابلی کو تہذیب و ثقافت میں مقدم سمجھتے تھے۔

یونانیوں کی نظر میں "یورپ" کا اطلاق صرف "ہیلینی" دنیا پر ہوتا تھا یعنی بلادِ یونان، ساحل ایشیائے کوچک، صقلیہ اور جنوبی اٹلی۔ جب کہ بلاد سکیت، جرمنی اور اسپین کا شمار بربرہ میں ہوتا تھا۔

رومی عہد میں جب کہ روم تہذیب و تمدن کا مرکز شمار ہوتا تھا "شرق" کا لفظ ان ملکوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو اٹلی سے مشرق کی جانب تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ کبھی شرق سے ان کی مراد ایران کی قدیم حکومت و سلطنت ہوتی تھی اور کبھی مقدونیہ کی شہنشاہیت بھی سمجھی جاتی تھی۔ بعد ازاں فیلپ العربی (۲۴۴ - ۲۴۹) کے عہد میں "شرق" کا لفظ ایک انتظامی وحدت پر بولا جانے لگا، اس لیے کہ فیلپ نے اپنے بھائی یولیوس بریسقوس کو شرق کا حاکم (RECTOR ORIENTS) کا لقب دیا تھا، جس کے بعد رومی حکومت کے مقبوضات میں سے لیبیا، مصر، فلسطین، شام، قبرص، آرمینیا، رومانیہ، یونان، کریٹ وغیرہ کے علاقے شامل تھے اور ان تمام ممالک پر مشتمل حکومت کا پایۂ تخت انطاکیہ تھا جہاں گورنر رہا کرتا تھا۔ اس انتظامی تقسیم کی بدولت ۳۹۵ء میں رومی حکومت مستقلاً دو حصوں یعنی شرقی اور غربی شہنشاہیت میں تقسیم ہوگئی، اور آگے چل کر جس میں مذہبی روح بھی کارفرما تھی۔ مغرب کی نمائندگی روم کے پوپ اور مشرق کی نمائندگی قسطنطنیہ کے بطریق کے روپ میں ہونے لگی۔

ظہورِ اسلام کے بعد جب اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو "شرق" کے استعمال کا مفہوم بھی بدل گیا۔ یعنی اس کا عام استعمال مسلم ممالک کے لیے ہونے لگا۔ صلیبی جنگوں کے درمیان "اسلام" سے مراد "مشرق" اور عیسائیت سے "مغرب" سمجھا جانے لگا۔ دولتِ عثمانیہ کے قیام اور یورپ میں اس کی مختلف فتوحات کے بعد "شرق" کے معنی

میں تھوڑی سی تبدیلی اس طرح ہوئی کہ "شرق" دولت عثمانیہ کا مترادف ہوگیا۔ "مشرقی مسائل" سے اہل یورپ کی مراد ہر اس مسئلہ سے ہوتی تھی جو عثمانیوں اور یورپین حکومت کے درمیان تصادم اور سیاسی حکمت عملی کی بنا پر پیدا ہوتا تھا اور یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہی جب کہ دولت عثمانیہ انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔

ان تاریخی انقلابات کی بنا پر "شرق" اور "غرب" کا مدلول بھی بدلتا رہا۔ اور اس کی وجہ سے جغرافیائی حدود کو مختلف طور پر سمجھا جاتا رہا۔ سکندر اعظم کے زمانے میں رومی حکومت کی حد نہر سندھ تھی جب کہ رومی عہد میں دریائے فرات اس کی حد تھی جو اسلامی فتوحات کے بعد سکڑ گئی اور دولت عثمانیہ (۱۵۲۹ء) میں ویانا (VEINAE) تک محدود ہو گئی۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ "شرق" کا استعمال ہی سیاسی، جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے اس طرح ہوتا رہا ہے کہ ازمنہ قدیمہ میں اس سے یونانیوں اور ایرانیوں، قرون وسطے میں مسلمانوں اور عیسائیوں اور زمانۂ حال میں دولت عثمانیہ اور یورپی ممالک کے درمیان ہونے والی تنازعات اور جنگیں مراد لی جاتی ہیں اور یہ اسی طرح ہے کہ جیسے ایک طرف عقلی، ثقافتی اور تمدنی میدان میں یورپ ایک نمایندہ سمجھا جاتا ہے اور ایشیا و افریقہ کو دوسرا نمایندہ سمجھا جاتا ہے۔

اس اجمالی اور سطحی نظریے کی بنا پر اکثر لوگوں کی نظر سے وہ فرق اور تضاد جو خود یورپی اقوام میں موجود ہے، اوجھل رہے اور بطور نتیجہ "مغرب" "مغربی تہذیب"، یا "مغربی فکر" جیسے اصطلاحات عام ہو گئے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا "مغرب" سے مراد پورا براعظم یورپ ہے جس میں بلقان اور روس بھی شامل ہیں یا یورپ کے بعض حصے مراد ہیں مثلاً فرانس، انگلینڈ، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ اور سکینڈے نیونا۔ دوسری طرف یہ بات ہے کہ کیا ہم نہیں جانتے کہ موجودہ دور کی سیاست میں "شرق" اور "غرب" ایک اور مفہوم کو ادا کرتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک طرف اس سے مراد سوویت روس اور دیگر اشتراکی ممالک کا اتحاد ہے جب کہ دوسری طرف اس سے

مراد ولایت ہائے متحدہ امریکہ اور اس کے حلیفوں کا اتحاد ہے۔

بہرحال وہ ممالک جن کے لیے "مشرق" کا لفظ پہلے کبھی استعمال ہوتا تھا اب ان کے لیے "مشرق ادنی" "مشرق اوسط" اور "مشرق اقصیٰ" یا "جنوب مغربی ایشیا" "عربی ممالک" یا "عالم اسلامی" جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس بات کو جاننے کے لیے کہ لفظ "مشرق" کا صحیح مدلول کیا ہے، ضروری ہے کہ ہم ایک طرف ان تعلقات کو پیش نظر رکھیں جو یورپی اقوام کے مابین ہیں اور دوسری طرف ان تعلقات کو جو ایشیائی اور افریقی عوام کے درمیان ہیں۔ انہی تعلقات کو پیش نظر رکھ کر ہم ان عوامل کا پتا لگا سکتے ہیں جو "استشراق" کی بنیاد ثابت ہوئے اور جن کی بنا پر مغربی اقوام نے مشرقی علوم وفنون کی تدریس کی میں دلچسپی لی۔

مشرق ومغرب کے تعلقات:

مشرق ومغرب کے تعلقات بہت ہی قدیم اور مربوط ہیں۔ تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے براعظم ایشیا وافریقہ اور یورپ — جو بیشتر انسانی آبادی پر مشتمل تھے کی قومیں ایک دوسری سے مستفید اور ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ قدیم یونانی ثقافت وتمدن کے میدان میں بہت حد تک مصریوں، بابلیوں اور فینیقیوں کے خوشہ چین تھے اور وہ طویل عرصے تک ان کا شاگرد سمجھتی رہی تھیں۔

جب ایرانیوں کی جنگوں نے یونانیوں کو مرعوب کیا تو یونانی شعرا وادبا نے اپنے شعر وادب کے ذریعے یونانی قومی جذبے کو خوب ابھارا اور اپنا قومی کردار اس طرح ادا کیا کہ ایرانیوں اور دوسری ان قوموں کو جو ایرانیوں کے زیر اثر تھیں، وحشی اور بربر کے خطاب سے نوازا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کا یونانی ادب مغربی ثقافت کی بنیاد بنا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مغربی اقوام مشرقی اقوام کی صورت کو مسخ کر کے پیش کرنے میں بھی خاص اثر رکھتی ہیں۔

سکندر اعظم کی فتوحات (جو تقریباً مشرق ومغرب پر محیط تھیں) کے بعد یونانی ثقافت ایشیا وافریقہ میں اس طرح پھیل گئی کہ اس کے اثرات دینی عقائد اور تصوف میں

شامل ہوگئے اور اس امتزاج کا نتیجہ HELEMEISTIC عالمگیر تہذیب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ رومن ایمپائر کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ مشرق پر مغرب کا اقتدار مقدر ہو چکا ہے لیکن بہت جلد ہی رومن ایمپائر میں اختلاف رونما ہوگیا اور رومن ایمپائر دو حصوں۔ مشرقی اور مغربی۔ میں منقسم ہوگیا، اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی اختلاف بھی جڑ پکڑتا گیا اور بازنطینیوں اور ساسانیوں میں جنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب اسلام کا ظہور ہوا اور عربوں نے مشرق کی قیادت سنبھالی۔ شام اور مصر ۶۳۴ء اور ۶۴۳ء میں علی الترتیب اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ مغربی مؤلفین ان دو ممالک کے اتنی جلد مفتوح ہونے کی توجیہہ صرف یہ کرتے ہیں کہ دونوں ممالک کے باشندے سریانی اور قبطی جو مشرقی تھے، "مغربی" بازنطینی حکومت کی تہذیب سے گلو خلاصی چاہتے تھے، اسی لیے یہ اسلامی مملکت کا حصہ بن گئے۔ مغربی مورخین اس بات کا اعتراف نہیں کرتے کہ اسلام تمام ادیان سماویہ کا تتمہ ہے، پھر یہ مورخین اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ خود مسیحیت مشرق میں نمودار ہوئی۔ درحقیقت مغربی لوگ اسلام کو جو ایشیا میں نمودار ہوا، یونان اور روم کے خلاف بغاوت کا مظہر قرار دیتے ہیں اور اس وقت سے اب تک مشرق اور مغرب کے اختلاف کو اسلام اور عیسائیت کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ قسطنطنیہ کے محصورین (جن کا عربوں نے ۷۱۷ء — ۷۱۸ء میں محاصرہ کیا تھا) یا شارلمین کی ۷۳۲ء میں کامیابی کے قصیدے اس لیے پڑھے جاتے ہیں کہ یہ دونوں مغربی مسیحی تہذیب و تمدن کے گماشتے اور ایجنٹ سمجھے جاتے تھے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان یہ نزاع صلیبی حملوں (جس کی کمان مغربی قومیں کر رہی تھیں) کی شکل میں انتہا کو پہنچ گئی، اپنے استعماری مقاصد کو پورا کرنے کے لیے عیسائیوں نے دینی عقائد کو آلۂ کار بنایا لیکن ان صلیبی قوتوں کو اس میں زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور دو سو سال کے اندر اندر مسلمانوں نے تمام مفتوحہ ممالک واپس لے لیے۔ ان تمام تعصب، کینہ، بغض اور دشمنی و سختی کے باوجود جو صلیبیوں کا شیوہ تھا، مسلمانوں سے بالذات تعلقات کی بنا پر ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ مشرقی لوگ تہذیب و تمدن کے تمام میدانوں میں ان سے برتر ہیں اور بطور فطری امر

ان کا خوف اور بغض پہلے تعریف وتحسین کی شکل میں ظاہر ہوا اور بعد ازاں ان کی طرف میلان کا رجحان بڑھا کہ ان کو پرکھیں اور ان سے استفادہ کریں۔ عربی یعنی اسلامی تہذیب مغرب پر کس طرح اثر انداز ہوئی، اس کا واضح ثبوت اندلس اور صقلیہ ہیں۔

صقلیہ میں نارمنڈی حکمرانوں۔ راجر اول، فریڈرک ثانی، الفرڈ۔ کے زمانے میں شہروں کی انتظامیہ کو چلانے کے لیے مثلاً پولیس اور مال کے محکموں میں، عرب کارندوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طرح گویا ان حکمرانوں نے اپنے گرد ایک کثیر تعداد مسلمان علماکی جمع کر رکھی تھی اور اس بات کا اہتمام کر رکھا تھا کہ مختلف علوم وفنون میں عربی کتابوں کا ترجمہ ہو اور ان کی تدریس ان کی جامعات میں اسی نہج پر ہو جس طرح مسلمانوں کے یہاں رائج تھی۔

طلیطلہ، عربوں کے زمانہ حکمرانی میں اہم علمی مراکز میں سے تھا، جب ۱۰۸۵ء میں سپانیوں کے قبضے میں آیا تو یورپ کے تمام گوشوں سے طلبا کی کثیر تعداد یہاں آپہنچی۔ اس کا انچارج پادری ریمنڈ (۱۱۳۰ء — ۱۱۵۰ء) مقرر ہوا، جس نے وہ مشہور مدرسہ قائم کیا جس میں ترجمے کا کام شروع ہوا اور یہ مدرسہ تیرھویں صدی عیسوی تک جاری رہا اس عرصے میں طب، فلکیات، طبیعیات اور فلسفے کی تمام اہم عربی کتب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوتا رہا۔ اس کے بعد یہ تحریک اسپین سے اٹلی منتقل ہوگئی جہاں سولھویں صدی عیسوی تک ترجمے کا کام ہوتا رہا۔ جب آسٹریا، جرمنی اور فرانس کے بعض علما عرب مصنفین کی طب اور صیدلہ کی کتابوں پر سترھویں بلکہ انیسویں صدی کی ابتدا تک اعتماد کرتے رہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ فن طباعت کے ایجاد ہونے اور کوپرنیکوس (COPERNIC) کے معرض وجود میں آنے کے بعد علمائے یورپ عربوں سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے۔ دوسری جانب مغربی کلیساؤں کے رہنماؤں کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اسلامی عقائد سے قطعاً نابلد ہیں اس لیے ضروری ہے کہ قرآن، احادیث اور علمائے اسلام کے اقوال کا ترجمہ ہو تاکہ وہ اس کے رد میں لکھ سکیں، اور اسلام کا توڑ اس طرح کر سکیں کہ اس کا اثر ان کی قوم پر پڑے۔ اور اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا کہ ایک دینی مجلس ۱۳۱۲ء — ۱۳۱۲ء میں بمقام ویانا (VEINA) قیام عمل میں آیا، جہاں سے مسیحی علما مسلم فلاسفروں کے نقطہ نظر

کی تردید میں لکھا کرتے تھے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو مشرقی علوم کے درس و تدریس کا کام کسی صحیح بنیاد پر قائم نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا یہ اقدام ابتدا ہی سے نزاع دینی کے تابع تھا۔

صلیبی جنگوں کے خاتمے کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ دولت عثمانیہ کے قیام کے بعد مشرق و مغرب میں جنگ کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا اور اس کے نتیجے میں قسطنطنیہ مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ سولھویں صدی تک عثمانی فوج یورپی ممالک کے قلب میں داخل ہوگئی۔ یورپ ترکوں کو ایشیا کا نمایندہ اور اسلامی قوت کا مظہر سمجھنے لگا اور فطرتاً ترکوں کا خوف اسلام سے کینہ اور ایشیا سے نفرت میں بدل گیا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سولھویں اور سترھویں صدی کے یورپی مصنفین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "ترکوں کا نبی" کہنے لگے اور ترک دشمنی میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملے اور اسلام کو طعن و تشنیع کرتے نظر آتے ہیں۔

اسی زمانے میں یورپ عالم اسلام پر چوردروازے سے حملہ کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے مثلاً افریقہ کو بحری راستوں سے اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ صلیبی حملوں کی ناکامی و ناکامیابی اور پھر بحر ہند میں بادشاہوں کی جانب سے تجارتی اجارہ داری دو ایسے عوامل تھے جنھوں نے یورپی اقوام کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہندوستان اور شرق بعید میں دوسرا طریقہ کار استعمال کریں اور اس طرح یورپی اقوام کا ان ممالک میں بحری سفر شروع ہوا۔ سولھویں صدی عیسوی میں یہ نئے نئے بحری اکتشافات کے مالک بن گئے۔ اس زمانے کا ایک پرتگالی بحری کپتان بوکرک لکھتا ہے کہ پرتگالی اس بات میں کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کی قوت کمزور ہو جائے۔ اس لیے پرتگالی پادری اسلام کے خلاف صلیبی پروپیگنڈے میں مشغول ہیں۔ ہندوستان میں حالات زیادہ موزوں اور مناسب ہیں اس لیے کہ ہندوستان پرتگالی استعمار کا گڑھ ہے۔ لیکن سلطنت مغلیہ کے قیام کے بعد سترھویں صدی میں ہندوستان کے حالات پھر تبدیل ہو گئے۔ اور ہالینڈیوں اور انگریزوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور پرتگالیوں کی جگہ انھوں نے لے لی اور

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی مدد کرنے لگے۔ ہندی ہالینڈی اور ہندی انگریزی دو کمپنیاں قائم ہوئیں جو بادی النظر میں خالص تجارتی تھیں لیکن پس پردہ ان میں سیاسی عوامل کارفرما تھے۔ مذہبی مسائل میں ان کمپنیوں نے غیر جانب داری کا اظہار کیا، اس لیے کہ یہ لوگ پروٹسٹنٹ عقیدہ رکھتے تھے۔ مذہبی مسائل میں جانب دار ہونے کی صورت میں ان کو دوہری مخالفت کا خوف تھا۔ ایک تو کیتھولک کی طرف سے جو مذہبی مسائل میں مشغول تھی اور دوسری طرف باشندگانِ ملک کی طرف سے جو ایسی صورت میں ان سے نفرت کر سکتے تھے۔

۱۷۱۵ء کے بحری معرکے میں آلِ عثمان کے کمزور پڑنے کے بعد یورپین کا خوف کچھ کم ہوا۔ سترھویں صدی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ عثمانی سلطنت کے اضمحلال اور ان کی قوت کی کمزوری سے یورپ فائدہ اٹھانے کی سوچنے لگا اور دولت عثمانیہ کے مقبوضات پر قبضے کی فکر میں لگ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ عسکری طاقت اور اقتصادی میدان میں آگے بڑھ چکا تھا۔ یورپ کو یہ فکر تھی کہ وہ اپنی مصنوعات کو کہاں بیچے؟ جس کے نتیجے میں مغربی استعماری طاقتیں، ایشیا اور افریقہ میں توسیع پسندی پر عمل پیرا ہوئیں۔ اس تجارتی مقصد کی بر آوری کے پیچھے سیاسی اقتدار کا حصول بھی تھا اور اس پورے دور میں انھوں نے سختی، دھوکہ بازی، فریب، خیانت۔ نقض عہد، بد دیانتی اور سب سے بڑھ کر دینی سازش کو اپنا اصول ٹھہرایا۔

سترھویں صدی عیسوی میں پرتگالیوں سے سیادت ہالینڈ یوں کے ہاتھ منتقل ہوئی۔ پھر انگلینڈ اور فرانس نمودار ہوئے جن کے درمیان مسابقت کی چپقلش اٹھارھویں صدی کے عرصے میں جاری رہی۔ انیسویں صدی میں صرف انگلستان ہی مردِ میدان رہا۔ اسی صدی کے آخر میں جرمنی اور اٹلی نے بھی استعمار پسندی میں حصہ لینا شروع کیا روس بھی اٹھارھویں صدی ہی سے دولت عثمانیہ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور توسیع پسندی کے میدان میں بلقان، قفقاز اور سنٹرل ایشیا کو عثمانی سلطنت سے الگ کرنے میں مشغول رہا۔

استشراق کی ابتدا کب ہوئی؟

مستشرقین کی جماعت نے استعماری توسیع پسندی میں بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے اور مشرق پر مغرب کی سیادت مکمل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

بعض مستشرقین کا قول ہے کہ یورپ میں مشرقی علوم کا سب سے اول مدرسہ طلیطلہ میں ۱۲۵۰ء میں قائم ہوا، جس میں عربی اور عبرانی زبان کی تدریس شروع ہوئی تاکہ ایسے لوگ تیار کیے جا سکیں جو مسلمانوں اور یہودیوں میں تبلیغی کام کر سکیں۔ تقریباً ۱۳۱۵ء میں اس مدرسے سے فارغ ہونے والا مشہور مبلغ ریمنڈ لولس (REYMUND LULLES) تھا۔ وہ عربی زبان پر مہارتِ تامہ رکھتا تھا اور عرب مصنفین سے اچھی طرح واقف تھا اور شاید زمانہ حاضر تک اس جیسا کوئی عربی دان مغربی ممالک میں نہیں ہے۔ اس نے قرآن و حدیث کی اچھی طرح تعلیم حاصل کی۔ متکلمین اور مسلم فلاسفروں کی کتابوں سے اسے واقفیت تھی۔ اپنی تالیفات میں جو مسلمانوں کے عقائد کی تردید میں ہیں، الفارابی، ابن رشد اور خصوصاً غزالی کی کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" کے حوالے وہ کثرت سے پیش کرتا ہے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مشرقی اور عربی علوم کے اکتساب کی ضرورت کا ایک عام رجحان تھا، اور اس کی تائید اس رسالے سے ہوتی ہے جس کا مولف ایک فرانسیسی PIERRE DUBIOS تھا، جس نے ۱۳۰۶ء میں بعنوان "ارض مقدسہ کی واپسی" تالیف کیا تھا۔ اس میں اس طریقہ کا ذکر ہے جس کی بنا پر یورپ کی اقوام کی جانب سے فرانسیسی بادشاہوں کے مشرق میں استعمار کو فروغ دیا جاتا تھا، اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ زبانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کیے جائیں جن میں استعماری سیاست کو پروان چڑھانے کے لیے تربیت یافتہ لوگ تیار کیے جائیں مثلاً عمالِ حکومت، پولیس، مترجم، سفراء، مبلغین، اطبا۔ ان مدرسوں میں ایسی یورپی لڑکیاں بھی مشرقی علوم حاصل کرتی تھیں جو مشرقی زعما سے شادی کرنا پسند کرتی تھیں تاکہ اس مہم میں وہ بھی اپنا کردار اچھی طرح ادا کر سکیں۔ اس دینی مجلس میں جو ویانا میں منعقد ہوئی تھی ریمونڈ نے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱۔ مختلف زبانوں کے لیے مدارس کا قیام اور ایسے مبلغین کی تیاری جو انجیل کی تعلیم کو تمام اقوام کے سامنے پیش کر سکیں۔

۲۔ دینی جذبے سے سرشار ایک فوجی یونٹ کا قیام جو مقدس شہروں کی بازیابی کے لیے کوشش کرے۔

۳۔ علما کو اس بات کا ذمہ دار بنانا کہ وہ ایسی کتابیں تالیف کریں جو کیتھولک عقیدوں کے منافی عقیدوں کی تردید میں ہوں۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ویانا میں منعقدہ مجلس نے یہ تجویز بھی پاس کی کہ روم، بولونیا، پیرس، آکسفورڈ اور سلمنکا کی یونیورسٹیوں میں عربی، عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کی تعلیم کے لیے مستقل اور باقاعدہ شعبہ قائم کیا جائے۔ لیکن ان زبانوں کی ہی اساتذہ کی کم یابی کے باعث کافی عرصے تک یہ شعبہ قائم نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی میں یہ کوشش اس طرح کامیاب ہوئی کہ عربی کے ترجمے کا کام ضرور شروع ہوا۔ مگر اس کے زیادہ تر اساتذہ اسپین کے یہودی تھے۔ اس بات پر توجہ دی گئی کہ طب، فلکیات اور فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ لاطینی زبانوں میں کیا جا سکے تاکہ اس کے معنویات سے واقفیت اور استفادہ ہو سکے۔ اس طرح گویا مشرقی علوم کی تعلیم محدود دائرے میں رہی۔ دوسری طرف ان کی تبلیغی کوششیں اس بات میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں کہ وہ ایسے لوگ تیار کر سکیں جو غیر مذاہب اور غیر زبانوں کا علم رکھتے ہوں۔ اس لیے مختلف وجوہ کی بنا پر مشرقی علوم کی تدریس سولھویں صدی کے بعد ہی عروج پر پہنچ سکی۔

اٹلی اور فرانس میں مشرقی علوم کی ابتدا

سولھویں صدی میں اٹلی میں مشرقی علوم سے دلچسپی خاص وجوہ سے ہوئی۔ پاپائے روم کے لیے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح مغربی اور مشرقی کلیساؤں کو متحد رکھا جا سکے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ عربی کے علاوہ دیگر مشرقی علوم سے بھی واقفیت ہو تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو اس طرف راغب کیا جا سکے۔ اس لیے پاپائے روم (یولیوس ثانی) نے ۱۵۱۴ء میں الصلوٰۃ السبع کو مصر کے قبطی یعقوبا کے لیے عربی میں نشر کرنے کا حکم دیا اور ۱۵۱۶ء میں نابیو کے پادری جوستیانی نے زبور کو چار زبانوں میں مع عربی کے نشر کیا۔

ثانیاً، روم اس زمانے میں مشرق کے ہر طرح کے لوگوں کی زیارت گاہ تھی، خواہ وہ عیسائی

ہوں یا امرا یا نا اثر یا مسلم تاجر ہوں۔ بایزید ثانی نے دو وفد اپنے بھائی جم کے سلسلے میں جس نے حکومت کا دعویٰ کیا تھا اور پھر یورپ سے پناہ طلب کی تھی، روم بھیجے تھے۔ ۱۵۲۰ء میں مراکش کے ایک شخص حسن بن محمد کو سمندری ڈاکوؤں نے پکڑ کر پوپ لیون دہم کے سامنے پیش کیا، جو نصرانی ہو گیا اور جس کا نام لیون افریقی رکھا گیا۔ یہ شخص علم جغرافیہ کا ماہر تھا۔ اس نے ۱۵۲۶ء میں افریقی ممالک کے متعلق ایک کتاب لکھی جس کے لیے اس نے مشہور عرب جغرافیہ دانوں البکری، المسعودی اور الادریسی کی کتابوں سے مواد جمع کیا تھا جو اس علم کے علاوہ تھا جو اس کے اپنے سفری تجربات اور ذاتی مشاہدات پر مبنی تھا۔

عربی مطابع

عربی چھاپے خانوں کا قیام بھی ایک اہم عامل ہے جس نے سولھویں صدی میں علوم مشرقی کی تدریس پر یورپ کی مساعدت کی۔ اس کا سہرا کارڈینل فرڈینانڈو دی میدیچی (F. di. Medici) کے سر ہے جس نے ۱۵۸۰ء کے قریب ایک عربی چھاپہ خانہ قائم کیا جس کی تجویز پوپ گریگوریس ہشتم نے کی تھی۔ اس کا مقصد کلیساؤں کے اتحاد کا پروپیگنڈا کرنا تھا۔ اس ضرورت کے تحت روم میں دو مدرسے قائم کیے گئے۔ ان میں سے ایک مارونین اور دوسرا ارمن کے لیے تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ عربی نصوص کو طبع کیا جائے۔ اس پریس کا انچارج ایک نوجوان ریمانڈی (REMONDI) تھا، جس نے کافی عرصے تک مشرق میں مقیم رہ کر عربی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ فن طباعت میں بھی ماہر تھا۔ اس بنا پر اچھے حروف میں لکھنا تھا جن کا پڑھنا آسان تھا۔ ۱۵۸۶ء میں ابن سینا کی دو کتابوں القانون اور النجاۃ کو یکجا طبع کرنا شروع کیا، جو ضخیم ہونے کی بنا پر ۱۵۹۳ء تک طبع ہو سکیں۔ اس اثنا (۱۵۹۰ء) میں انجیل، ابن حاجب کی "الکافیہ" اور ابن اجروم کی الاجرومیہ طبع کی گئیں۔ اس کے بعد الادریسی کی کتاب "نزهة المشتاق فی ذكر الامصار والاقطار والبلدان والجزر والمدائن والآفاق" کے بعض حصوں کو طبع کیا گیا۔

۱۵۸۸ء میں اس مطبع کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ مراد ثالث نے اس کو طوسی کے "مبادی اقلیدس" کا ترجمہ مملکت عثمانیہ میں فروخت کرنے اور تقسیم کرنے کی اجازت

دی مگر اس کی طباعت کا کام ۱۵۹۴ء سے پہلے مکمل نہ ہو سکا۔

کچھ عرصے بعد اس مطبع کا کام بند ہو گیا۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ مشرق میں اس کی مانگ نہ بڑھ سکی۔ اس لیے کہ وہ اس رسم الخط کے عادی نہ تھے۔ اس کے علاوہ اغلاط کی بھرمار تھی۔ مزید براں مشرق کے لوگ مغرب کی تمام چیزوں کو عام طور پر خوف اور شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بہر حال مطبع نے دوبارہ اس وقت کام شروع کیا جب پوپ پولس پنجم (۱۶۰۵ – ۱۶۲۱) میں پوپ بنا۔ اس نے مشرق کی کتابیں طبع کرانے پر بہت زیادہ رقم خرچ کی۔

رایمونڈی کی (۱۶۱۴ء میں) وفات کے بعد اس کے شاگرد سٹیفانوس بولینوس نے اس کام کو سنبھالا اور فرانسیسی سفیر F. S. de BREVER کی کوشش سے ایک دوسرا عربی مطبع روم میں قائم کیا۔ سفیر مذکور استنبول میں سفیر رہ چکا تھا۔ مشرق میں فرانس کی تقلیدی سیاست کا متبع تھا۔ کیتھولک چرچ اتحاد کی کوششوں کا موید اور حامی تھا، اس نے اپنے خرچ پر کارڈینال ملانبین کی کتاب "کتاب الصلوٰۃ" کا عربی ترجمہ شائع کیا۔ اس کا ترجمہ دو شخصوں نے کیا تھا جو روم میں عربی زبان کے استاد تھے۔ جب یہ سفیر فرانس لوٹا تو اس کے ساتھ بولینوس مذکور بھی گیا اور اپنے عربی کے حروف بھی ساتھ ہی پیرس لے گیا اور ایک عربی پریس وہاں قائم کیا۔

بہت جلد ہی یورپ میں دوسرے مطبع قائم ہونے لگے۔ خصوصاً ہالینڈ میں مستشرق رافلیجیوس (REPHELENTIUS) جرمنی میں کورسٹن (KURSTEN) نے جو طبیب تھا، عربی کی تعلیم حاصل کی تھی تاکہ ابن سینا اور اس کے علاوہ دیگر اطبا اور فلاسفروں کی اصل کتابوں سے استفادہ کر سکے۔ اول الذکر کو اپنی حکومت سے کوئی مدد نہ ملی اس لیے اس نے اپنا مطبع سویڈن منتقل کر دیا۔

مشرق کی سیاحی

مغرب کے لوگوں کے لیے مشرقی علوم کی طرف راغب ہونے کی ایک وجہ وہ دلچسپ کتابیں بھی تھیں جنھیں بعض سیاحوں نے سولھویں صدی میں نشر کیا تھا، جن میں مشرقی

ملکوں، وہاں کے عجائبات، لوگوں کے عادات و اطوار، بادشاہوں اور حکمرانوں کے شاندار محلات اور ان کے عجائبات کا تذکرہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ان ملکوں کے سیاسی تعلقات اور اقتصادی امور سے واقفیت بھی درج تھی۔ ان مہم جو مسافروں کے لیے جس نے راستہ ہموار کیا تھا وہ وہ وفود تھے جو یورپ کے حکمرانوں، سلاطین عثمانیہ، شاہ ایران اور مغل درباروں میں بھیجا کرتے تھے، اس کے علاوہ مسیحی تبلیغی جماعتیں تھیں جو ہندوستان اور چین کو جایا کرتی تھیں۔

فرانسو اول اپنے وفود سلطان سلیمان قانونی کے پاس بھیجا کرتا تھا تاکہ اس کی دوستی برقرار رہے۔ شارلکن، شاہ اسماعیل (ایران) کی ترکوں سے عداوت کی بنا پر خط و کتابت کے ذریعے تعلقات قائم رکھے ہوئے تھا۔ یہ بات معلوم ہے کہ سلطان سلیم اول کے زمانے سے ایرانیوں اور ترکوں میں جو جنگ جاری ہوئی تھی اس کا باعث مذہبی اختلاف تھا۔

Lodovico Vorthema ایک طلیانی سیاح تھا جو ۱۵۰۳ء میں وینس سے مصر گیا، پھر شام گیا جہاں اس نے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی اور مسلمان کے بھیس میں حج کے قافلے میں شامل ہو گیا۔ یہ پہلا یورپی تھا جس نے مکہ مکرمہ دیکھا۔ بعد ازاں یمن سے فارس ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ یہاں کے بعض مسلم حکمران اس کی عسکری فن میں مہارت سے بہت متاثر ہوئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایسے ہتھیار بنائے جن سے پرتگالیوں کے خلاف مدافعت کی جا سکے لیکن یہ پرتگالیوں سے جا ملا اور ان کو بتایا کہ اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرے۔

دوسرا طلیانی سیاح اور مہم جو (Pietro della Valla) تھا جو ۱۶۱۴ء میں وینس سے استنبول گیا، ترکی زبان سیکھی، مصر اور شام ہوتا ہوا بیت المقدس کی زیارت کو گیا، اس کے بعد عراق اور فارس گیا۔ شاہ عباس کے دربار میں اس نے کافی رسوخ حاصل کیا اور ترکوں کے خلاف ایرانیوں کے ساتھ جنگ میں بھی حصہ لیا۔ ترکوں کی ضد میں اس نے ایران اور روس قوازق کے درمیان معاہدے کے انعقاد

میں حصہ لیا۔ بعد ازاں ہندوستان گیا اور وہاں کے مشاہدات کو ایک مجموعے میں اس طرح قلم بند کیا کہ جس طرح کہ اس نے شاہ عباس کے متعلق ایک تاریخی کتاب لکھی تھی۔ اس کی زندگی میں صرف اس کے رسائل ہی طبع ہو سکے تھے۔ یہ رسائل نہ صرف یہ کہ شہروں اور اس کے باشندوں پر مشتمل ہیں بلکہ یہ کہ ان میں سیاسی مسائل کا بھی ذکر ملتا ہے۔ خصوصاً ان جنگوں کا ذکر بھی ہے جو شاہ عباس پرتگالیوں کی مخالفت میں انگریزوں کی مدد کی صورت میں کرتا رہا تھا۔

یہ پہلا یورپی مؤلف ہے جو بابل اور پرسی پولیس کے کھنڈرات کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے بہت سے مشرقی مخطوطات کو یورپ منتقل کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس نے نقش و نگار اور آثار قدیمہ کی تحریروں کو یورپ پہنچایا۔

سولھویں صدی میں دوسرے مغربی ممالک کے سیاحوں کی طرح انگریز سیاح بھی مشرقی ممالک اور وہاں کے باشندوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے میں حصہ لینے لگے۔ مشرق کی طرف سیاحی کرنے والوں میں تین انگریز بھائی مشہور ہیں یعنی تھامس، انتھونی اور رابرٹ شیرلے۔ انتھونی اور رابرٹ ۱۵۹۸ء میں ایران جا کر شاہ عباس کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ چونکہ یہ دونوں فن جنگ میں ماہر تھے اس لیے دربار میں ان کا اثر و نفوذ تھا۔ یہ ایرانی فوج کو نئے طریقوں پر منظم کرنے کے کام پر مقرر ہوئے اور اس کی وجہ سے ایرانیوں کو ترکوں سے آئندہ جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی۔ شاہ عباس نے انتھونی کو اس وفد کی قیادت سپرد کی تھی جو اس نے یورپ کے ممالک میں اس غرض سے بھیجا تھا کہ دولت عثمانیہ کے مقابلے میں یورپی ممالک سے صلح و آشتی کا معاہدہ کیا جائے، لیکن انتھونی اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ رابرٹ نے اپنی بھتیجی کی شادی شاہ سے کر دی تھی، اور ایک رسمی مشن پر یورپ بھی گیا تھا۔

تیسرا بھائی تھامس ترکی گیا اور اس نے اپنا سیاسی کردار ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے دونوں بھائیوں کا کردار معلوم ہونے کے بعد کہ وہ ایران میں عثمانی سلطنت کے خلاف سازش میں مصروف ہیں، اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا، جہاں سے وہ انگریز

سفیر کی مداخلت پر تین سال بعد رہا ہوا۔ ان تینوں بھائیوں کے سفرنامے ایک کتاب کی شکل میں ۱۶۰۷ء میں چھپے تھے۔

سترھویں صدی میں فرانسیسی سیاحوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی ممالک پہنچی تھی، ان سب کی رہنمائی کرنے والا پادری رافائیل دومان تھا جس نے ۱۶۴۴ء میں حلب سے بغداد کا سفر کیا اور دو سال بعد ایران چلا گیا جہاں اپنی موت ۱۶۹۶ء تک رہا۔ شاہ عباس ثانی کے دربار میں اُس کا کافی اثر و رسوخ تھا، اس لیے کہ اس نے ایرانی حکومت میں بہ حیثیت ترجمان کام کیا تھا، اور ریاضی اور فلکیات میں معلومات رکھنے کی وجہ سے اُن کی خدمت انجام دی تھی، اس کے نوٹس کو جو ۱۶۶۰ء تک کے ایران کے حالات پر مشتمل تھے اور جو اس نے وزیر قولبیر کو روانہ کیے تھے مستشرق شیفر نے شائع کیا تھا، یہ نوٹس مختلف حصوں، قوم اور حکومت کے متعلق بیش بہا معلومات پر مشتمل تھے۔

سابقہ سیاحوں کے مقابلے میں جو مشرق پر متعجب تھے، دومان مشرق سے نفرت کرتا نظر آتا ہے، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شخص ایرانیوں کو دوسری مشرقی قوموں پر "اندھوں میں کانا راجہ" کہہ کر ترجیح دیتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سترھویں صدی میں یورپ کے تمام سیّاح اور زائر دومان کی رائے سے متفق نظر آتے ہیں، یعنی یہ کہ یورپی تہذیب کو مشرقی تہذیب سے برتر سمجھتے تھے اور لوگ یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں کہ مشرق کے تنزل کے اسباب کیا ہیں۔

اس سوال کا جواب فرانسیسی سیاح برنیر دیتا ہے جس نے مصر کی سیاحت کی جہاں اس نے ایک سال سے زیادہ عرصہ قیام کر کے عربی زبان سیکھی تھی۔ اس کے بعد تقریباً ۱۶۶۰ء میں وہ ہندوستان گیا اور بارہ سال تک وہاں مقیم رہا۔ مختلف مقامات پر گھوم پھر کر وہاں کے حالات کو رسائل کی شکل میں مرتب کرتا رہا اور ایک رپورٹ وزیر قولبیر کے پاس روانہ کی جس میں شہروں کے حالات، مغل بادشاہ اور جو کچھ امپورٹ ہوتا تھا۔ اس کے متعلق رپورٹ تھی، مؤلف مذکور نے مشرقی ممالک کے انحطاط کے متعلق لکھا کہ اس کی علت اولیٰ یہ ہے کہ ہندوستان اور دیگر مشرق قریب میں زمینوں کی خاص ملکیت کا فقدان ہے۔

ان مذکورہ سیاحوں کے مختلف مقاصد تھے، مثلاً مہم جوئی، تبلیغی امور یا مادی فوائد تھے، یا جاسوسی اور سیاسی اغراض تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر سے یہ بات ظاہر ہونے لگی تھی کہ کچھ سیاح صرف علمی اغراض کی بنا پر آنے لگے تھے، اس سلسلے میں فرانسیسی سیاح آنکتیل دوپرن (۱۷۳۱ء-۱۸۰۵ء) کا نام لیا جا سکتا ہے،

جس نے پیرس میں مشرقی علوم حاصل کیے تھے اور ۱۷۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں بہ حیثیت عام فوجی شامل ہوا تھا، لیکن لوکس پانڈچیری کو جب اس کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو اس نے اس کے لیے خاص سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا، ساتھ ہی کمپنی نے بھی اس کا مرتبہ بڑھا دیا اور اس کی مدد کی کہ وہ مختلف علاقوں میں سیر و سیاحت کرے۔ اس شخص نے اپنی کوششیں اس بات پر صرف کیں کہ مشرقی علوم کے مخطوطات کا پتا کرے، جب یہ شخص ۱۷۷۱ء میں فرانس لوٹا تو ژند اوستا جو زرتشت مذہب کی کتاب ہے اس کا ترجمہ نشر کیا، اس کا یہ انکشاف مشرقی علوم کی تدریس کے سلسلے میں ایک اہم کارنامہ ہے

دوسرا مشہور فرانسیسی سیاح Volney ہے جو ۱۷۵۷ء میں ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا تھا، اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی دولت مشرق کی سیاحی پر صرف کرے گا، اس لیے مشرقی علوم حاصل کرنے کے بعد پہلے مصر پھر شام گیا جہاں تین سال (۱۷۸۳ء - ۱۷۸۶) تک مقیم رہا۔ اسی اثنا میں وہ اٹھارہ ماہ جبل و روز کی ایک درس گاہ میں رہا تا کہ عربی زبان میں پوری مہارت حاصل کر سکے۔ اپنی مشہور کتاب "شام کا سفر" میں اس نے ان حوادث کا ذکر کیا ہے جو اس کے ساتھ پیش آئے تھے، نہ صرف یہ کہ وہ مقامات کی توصیف اور باشندوں کے معاشی طریقوں کو بیان کرتا ہے بلکہ ان اسباب کو بھی بیان کرتا ہے جو ترک حکومت کے زیر اثر آنے کے بعد مصر اور شام کے اقتصادی تنزل کا باعث بنے۔ وہ ان لوگوں کی رائے سے متفق نہ تھا جو یہ کہتے ہیں کہ مشرقی ممالک کے حالات کی تبدیلی موسم کی بنا پر ہے اور نہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ سخت گرمی لوگوں کی پیداواری قوت کو کمزور کر دیتی ہے، اس لیے کہ مصر کی طبعی حالت آج بھی وہی ہے جو قدیم مصر کے زمانے میں تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ مشرق کی پس ماندگی کا سبب صرف یہ ہے کہ حکومت کے ادارے ناقص ہیں اور یہ کہ دینی عقائد بھی اس سے متاثر ہیں۔ ایک رسالے میں لکھتا ہے کہ ان کی اقتصادی حالت بہت حد تک درست ہو سکتی ہے، اگر نہر سویز کے درمیان پل تعمیر کیا جائے جس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔

اٹھارویں صدی سے دور حاضر تک مشرق اور عرب ملکوں کی سیاحت جاری رہی، لیکن ہر سیاحت کی غرض و غایت علمی استفادہ نہیں رہی بلکہ ان میں اکثر کی غرض و غایت استعمار کو سیاسی، اقتصادی اور مذہبی اعتبار سے مستحکم کرنا تھا۔ برٹن (Burton) دوتی (Doughty) فان اوپنہائم (Von Oppenheim) لارنس اور فلبی جیسے سیاح انہی میں سے تھے۔

فرانس میں استشراق کی ابتدا: سولھویں صدی میں یورپی مسیحی حکومتوں اور دولت عثمانیہ کے درمیان تعلقات بڑھ گئے اس لیے کہ سلیم اول (۱۰۲۰-۱۰۱۲) کے دور میں دولت عثمانیہ شام اور مصر تک بعد ازاں سلطان سلیمان القانونی کے زمانے میں ہنگری اور اسٹریا تک پھیل گئی تھی۔ شاہ فرانس (فرانسو اول) نے سلطان سلیمان القانونی کے پاس تحائف بھیجے اور اپنے دشمن شارلکن کے خلاف مدد طلب کی۔ استنبول میں وفود آنے کا سلسلہ شروع ہوا، سلطان ترکی نے ان کو خصوصی مراعات یہ عطا کیں کہ اُن کو ترکی میں اقامت اور تجارت کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی ساتھ قونصل خانے کو یہ اجازت دی کہ فرانسیسیوں کے آپس کے جھگڑے کا فیصلہ خود کرلیں۔

ان حالات نے مشرقی علوم کی تحصیل کی ضرورت مہیا کی، اس لیے فرانسو اول نے اپنے سفیروں کے ساتھ کئی اصحاب علم لوگوں کو استنبول بھیجا تاکہ وہ مشرق کے حالات سے باخبر ہوں، ایسے ہی لوگوں میں غیلیوم پوسٹل (Guillaume Postel) تھا، یہ پہلا شخص تھا جو پیرس یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم دینے پر فائز ہوا، پوسٹل کے شاگردوں میں اہم ترین شہرت کا مالک جوزف اسکالیگر (J. Scaliger) -(۱۵۴۰ - ۱۶۰۹ء) تھا، جو نہ صرف یونانی زبان اچھی طرح جانتا تھا بلکہ اس کی شہرت مستشرق کی حیثیت سے تھی، اس کا باپ طلیانی الاصل طبیب تھا، جوزف اسکالیگر فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں رہا، پروٹسٹنٹ عقیدہ اختیار کیا، انگلینڈ، اٹلی، ہالینڈ میں اس نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ اور وہیں مرا۔ جوزف کے نزدیک اس کا استاد ان تمام زبانوں میں مہارت نہیں رکھتا تھا جس کا اُس کو دعویٰ تھا، اور جوزف بہت سے مسائل میں اپنے استاد سے خلاف رائے رکھتا تھا۔

اپنی ایک کتاب میں اس نے تمام ملکوں اور زمانوں کی مختلف تقویمات کو جو اس کو میسر آسکی تھیں، جمع کرکے ترتیب دیا، ان کی تشریح اور ان کا مقابلہ جولین کلینڈر سے کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ اختلافات کا حساب لگانا کس طرح ممکن ہے۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں فرانس کی توجہ کا مرکز دوسرے ملکوں کے مقابلے میں چین اور اس کی تہذیب کا مطالعہ تھا، دینی مبلغین ان ملکوں پر آئے اور اُن کے متعلق کتابیں شائع کیں، اس عرصے میں بہت ہی کم فرانسیسی مستشرق تھے جو عربی کی تعلیم اور اسلامی حالات سے واقفیت رکھتے تھے۔ عربی اور اور اسلامی ممالک کے متعلق تعلیم کا زور، وزیر قولبیر کے زمانے سے ہوا، جس نے ۱۶۹۹ء میں ایک انجمن موسوم بہ

"شباب اللغات" قائم کی، جہاں لوگ شاہی خرچ پر عربی کی تعلیم حاصل کرتے تھے، پھر اُن کو استنبول بھیجا جاتا تھا تاکہ تعلیم مکمل کر سکیں۔ اس کے بعد اُن کو سیاسی مشن میں کامیاب کیا جاتا۔ اسی قسم کی سوسائٹیاں ۱۷۰۸ اور ۱۷۲۱ء میں بنائی گئیں۔ اس طرح فرانس میں استشراق کی ابتدا دینی، تبلیغی، اقتصادی اور سیاسی جذبے کے تحت ہوئی۔

جرمنی میں استشراق کی ابتدا

جرمنی میں استشراق کی ابتدا کے لیے پہلا محرک دینی تھا، اس لیے کہ پروٹسٹنٹ تحریک نے اس بات پر زور دیا تھا کہ توراۃ کی طرف رجوع کیا جائے اور یہ کہ مقدس کتابوں کو اس کی اصلی زبان میں پڑھا جائے تاکہ اس کی حقیقت سے واقفیت ہو، اس طرح عبرانی اور سریانی زبانوں کی تعلیم اولاً لازم ٹھہری۔ پھر اس میں عربی زبانوں کی مدد کی ضرورت سمجھی گئی جسے اسلامی عہد میں یہودیوں نے عربی اور عبرانی زبانوں کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا، اپنی زبان کی لغت کی تحلیل اور اس کے قواعد مرتب کرنے میں وہ عربی زبان کی نحوی کتابوں کی تقلید کرتے تھے۔ یوروپی مسیحی عبرانی لغت کی تعلیم میں داؤد القمحی (وفات ۱۲۳۵) کی کتاب "النحا خام" پر اعتماد کرتے تھے، اس نے اکثر مصطلحات اور اس کی مثالیں عربی مصادر سے لی تھیں، مذہبی علما توراۃ کی تدریس میں اکثر کلمات، عبارات اور غریب عبرانی صیغوں کی تفسیر میں عربی زبان سے مدد لیتے تھے۔

ہائیڈلبرگ میں ۶۰ ء سے استاد ترمیلیوس مشرقی علوم پڑھاتا تھا، یہ اصلاً اٹلی کا یہودی تھا، کیتھولک عقیدہ چھوڑکر اس نے پروٹسٹنٹ عقیدہ اختیار کر لیا تھا۔ ۱۵۶۹ء میں اس نے کلدانی اور سریانی زبانوں کے قواعد کی ایک کتاب لکھی، ان مخطوطات میں سے جو جرمنی کے بادشاہ نے بوسٹل سے خریدا تھا، ترمیلیوس نے انجیل کا سریانی ترجمہ لاطینی لفظی ترجمے کے ساتھ نشر کیا۔

اس کا جانشین، اس کا شاگرد اور داماد فریڈرک یونیوس بنا، اس نے عربی زبان سیکھی تھی عربی انجیل کا ترجمہ اس نے لاطینی زبان میں کیا، اس کے شاگردوں میں یعقوب کریشمان —— (۱۵۵۵ - ۱۶۱۳) تھا جس نے طب اور علوم طبیعہ میں عربی زبان سے استفادہ کیا۔ ایک مذہبی عالم شیالی اسی زمانے میں تھا جو ایک عربی پریس قائم کرنے کا محرک تھا، اس نے انجیل کا عربی ترجمہ شائع کر کے اس کے نسخے مشرقی ممالک کو بھیجے تاکہ اس کو ماننے والے اس کی حقیقت کو سمجھیں اور مذہب کے نور سے روشنی حاصل کریں، لیکن جرمن امرا میں کوئی بھی اس بات پر راضی نہ ہوا کہ اتنا

مالِ کثیر اس پر خرچ کیا جائے۔ اس طرح اس کا تبلیغی مشن ناکامیاب رہا۔

ہالینڈ میں استشراق کی ابتدا

ہالینڈ میں استشراق کی ترقی کے لیے حالات سازگار تھے اس لیے کہ وہاں کے باشندے مشرقی ممالک خصوصاً ہند کے مشرقی جزیروں میں تجارت کی اہمیت سے واقف تھے جہاں سے اُن کو کافی مالی منافع حاصل ہوتے تھے، ساتھ ہی غیر ملکی زبانوں کی معرفت کے فوائد سے بھی واقف تھے جو اقتصادی اور سیاسی تعلقات کو مضبوط کرنے کا باعث تھے۔

۔یورپ کے اسپین پر غلبہ، متحدہ جمہوریہ ہالینڈ کے قیام اور سولھویں سترھویں صدی میں اپنی تجارت میں کامیابی کے بعد یورپ کی تاریخ میں ہالینڈ ایک بلند مقام پر پہنچ گیا تھا۔ ہالینڈیوں کے عربی ممالک میں مراکش، جزائر اور لیبیا سے شام تک تجارتی اور عمدہ سیاسی تعلقات قائم تھے، اِن ممالک سے تعلقات کی بنا پر عربی زبان سے واقفیت ضروری تھی، اسی طرح جب ہالینڈیوں نے مشرقی ہند میں پرتگالیوں کی جگہ لی تو ان کے لیے ضروری ہوا کہ وہ اسلامی عقائد سے واقفیت حاصل کریں تاکہ وہاں کے مسلمانوں کی نفسیات کو سمجھ سکیں جن کی اکثریت تھی اور جن کے ہزاروں لوگ ہر سال حج کو جایا کرتے تھے، مزید براں اصلاحی تحریک (پروٹسٹنٹ) بھی ہالینڈیوں کے لیے استشراق میں حصہ لینے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ یہ اصلاحی تحریک اس بات پر زور دیتی تھی کہ کتب مقدسہ اور اس کی تفسیریں، عربی اور عبرانی زبانوں میں ورک کا مطالبہ کرتی ہیں۔

ہالینڈ ہی نہیں، پورے یورپ میں عربی زبان کو ٹھوس بنیاد پر قائم کرنے میں ہالینڈ ی مستشرق تھامس اپرنٹوس (Thomas Epernius - ۱۵۸۴-۱۶۲۴) کا بہت بڑا حصہ ہے، اس نے دینی تعلیم حاصل کرنا لیڈن میں شروع کی لیکن مشہور فرانسیسی مستشرق اسکالیجر کے مشورے سے عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا، اور ۱۶۰۹ء میں پیرس منتقل ہوگیا، پیرس میں شاہی کتب خانے کے مہتمم اسحٰق قازوبونس (Issac Casaubonus - 1009-1614) سے رابطہ قائم کیا جو اپنے زمانے کے اہم علما میں سے تھا، اس نے اِسے عربی کتابوں اور مخطوطات سے استفادہ کا موقع دیا اور ساتھ ہی اپنی تیار کردہ لغوی ڈائری کے متعلق بھی اُس کو بتایا، اِس سے پہلے بہرحال اُس کی ملاقات ایک مصری یعقوبی سے ہوئی، جس کا نام یوسف بن ابی ذقن تھا، جس سے عربی میں گفتگو ہوتی تھی، اس کے

علاوہ پیرس کے نواح میں رہنے والے ایک مراکشی تاجر احمد بن قاسم اندلسی سے ہوئی جس کے ساتھ اسلامی عقاید پر بحث ہوتی تھی، اس کے ساتھ طویل مباحثے کے بعد تھامس کا کہنا تھا کہ یہ بات آسان نہیں ہے (جیسا کہ سمجھا جاتا ہے) کہ مسلمانوں کو قائل کر کے مسیحی عقائد کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔

لیڈن یونیورسٹی (۱۵۷۷ء) کے منتظمین نے عربی تدریس کی اہمیت جان کر ایک خاص شعبہ اس کے لیے مقرر کیا، ۱۶۱۳ء میں اربنیوس اس عہدہ پر مقرر ہوا، اس کی قابلیت کے لوگ قائل تھے اور اپنی وفات ۱۶۲۴ء تک جن میں وہ تدریس کرتا رہا ایک گہرا اثر چھوڑا۔ اس نے عربی قواعد کی ایک کتاب تالیف کی اور جرجس بن العمید کی کتاب "تاریخ المسلمین من صاحب شریعۃ الاسلام ابی القاسم محمد الی الدولۃ الاتابکیۃ" کو نشر کیا۔

اربنیوس نے اپنی ذاتی دولت سے "لیڈن پریس" قائم کیا جو عربی کتابوں کی طباعت کے لیے مشہور ہوا اسی طرح اربنیوس نے اپنی عربی اور عبرانی زبانوں کے تمام مخطوطات، لیڈن یونیورسٹی کی لائبریری کو وقف کر دیے جس میں اس کے دو مشہور شاگردوں غولیوس (GoLius-1596-1667) اور وارنر (Warner - 1608-1665ء) جو اربنیوس کے بعد منصب تدریس پر فائز ہوئے تھے، بہت سی قیمتی عربی مخطوطات جن کو ان دونوں نے استنبول، شام اور مغرب اقصی سے جمع کیا تھا، جمع کر کے خاطر خواہ اضافہ کیا۔

اس کے بعد ہالینڈی مستشرقین میں ہاردیان ریلانڈ (H - Reland) کا نام آتا ہے جو اوترخت یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر تھا، یہ عربی زبان کی تعلیم کا بہت ہی دلدادہ تھا، اس کا کہنا تھا کہ مقدس کتابوں کی تفسیر میں عربی زبان بہت ہی مددگار رہے، ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ مذہب اسلام اور ان قوموں کی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو عربی زبان بولتے ہیں۔ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تقریباً دو سال تک مشرقی علوم کی تعلیم کے میدان میں ہالینڈ دوسرے یورپی ممالک کا لیڈر رہا۔

برطانیہ میں استشراق کی ابتدا

برطانیہ میں بھی عربی زبان کی تدریس دینی اسباب کی بنا پر شروع ہوئی اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جان سیلڈن (J-selden 1584-1654) نے ۱۶۴۲ء میں اسکندریہ کے کلیسا کے قیام کی تاریخ سے متعلق "تاریخ ابن بطریق" جو

شائع کی تھی تو اس سے اس کا مقصد مذہبی لوگوں کی تاریخ اور ان کے عہدوں کا بیان کرنا تھا، اور یہ وہ زمانہ تھا جب کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں شدید جھگڑا چل رہا تھا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی (۱۶۳۶ء) میں عربی زبان کی تعلیم کا آغاز پادری لانڈ (Laud) کی درخواست پر ہوا۔ مستشرق ایڈورڈ پوکوک (E. Pocock ۱۶۰۴-۱۶۹۱ء) پہلا شخص تھا جس نے یہ شعبہ سنبھالا۔ یہ شخص پادریوں میں سے تھا، اس نے ابن العبیری کی "تاریخ مختصر الدول" کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ کتاب اسلامی تاریخ میں مسیحی نقطۂ نظر پر مشتمل ہے۔ اسی پوکوک خاندان میں رچرڈ پوکوک اٹھارویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس نے مشرق ادنیٰ کا سفر کیا۔ ۱۷۴۳ء میں مصر سے متعلق ایک کتاب شائع کی، پھر ۱۷۴۵ء میں ایک اور کتاب دو اجزا پر مشتمل شائع کی جس میں فلسطین، شام، عراق، قبرص ایشیائے کوچک اور یونان سے متعلق حالات درج تھے۔

انگریزوں کی نظریں اس وقت ہندوستان پر تھیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں اس پر اپنا قبضہ کرنے کے بعد اس کو دوام بخشنے کے طریقے تلاش کرنے لگے۔ اس کے لیے اُن کی نظر مشرق قریب پر پڑی اور خاص کر عربی ممالک پر، اس لیے عربی زبان بشمول مقامی لہجوں کی تعلیم کی طرف ان کی خاص توجہ ہوئی، انگریز علما جزیرۃ العرب کی سیاحت پر جانے لگے اور مختلف مقامات پر سیاحی کی، ان کے حکمرانوں، لیڈروں اور قبیلوں سے ملاقاتیں کی۔

انگریزوں کے لئے مشرقی علوم کا حصول ہمیشہ سیاسی رنگ میں رہا اور اسی کی وجہ سے برطانوی استعمار کو ان خطوں میں پنجہ گاڑنے میں مدد ملتی رہی۔

روس میں استشراق کی ابتدا

اگرچہ روس کے تجارتی اور سفارتی تعلقات ترکوں اور ایرانی صفویوں کے ساتھ پندرھویں اور سولھویں صدی سے قائم تھے، لیکن علمی اعتبار سے اس معنی میں وہ بہت پیچھے تھا کہ سترھویں صدی سے پہلے کسی ایسے مصنف کا نام نہیں ملتا جس نے مشرقی ممالک کے متعلق لکھا ہو۔

اہم کتاب "السجل الروسی" (روسی ریکارڈ) مرتبہ اس کو خرونوگراف (Russku Khronograff) جس میں وہ ترکوں اور اسلام سے بحث کرتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتاب حکومت کی ترغیب پر مرتب کی ہے، جس کی بنیاد سفرائے

روس کی تقریریں ہیں یا کچھ عربی مصادر اور بعض مغربی کتابوں سے اقتباس ہے۔

سترھویں صدی کے آخر میں زار روس کی حکومت مضبوط ہونے کے بعد اس کا جھگڑا سلطنت عثمانی اور ایرانی حکومت سے شدت اختیار کر گیا تو اس بات کا احساس ہوا کہ مشرقی ممالک کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے، بطرس اعظم نے ۱۷۰۲ء میں علوم شرقیہ کا پہلا سکول قائم کیا، جس کے لیے غیر ملکوں سے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں، پھر ۱۷۱۶ء میں ایران میں روسی سفارت کاروں میں سے پانچ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ عربی، فارسی اور ترکی زبان سیکھیں۔ ۱۷۲۴ء میں اسی قسم کا ایک وفد استنبول بھیجا گیا۔

روسی ایرانی جنگ (۱۷۲۱ء-۱۷۲۲ء) کے دوران روسیوں کو شہر دربند میں عربی، فارسی، ترکی، منگولی اور آرمینی زبانوں کے مخطوطے ہاتھ آئے، بطرس اعظم نے ان مخطوطوں کو دوسری دستاویزوں اور نادر اشیا کے ساتھ ایک خاص خزانے میں جمع کرنے کا حکم دیا، یہی خزانہ بعد میں ایشیائی عجائبات کی بنیاد بنا جو ۱۸۱۸ء میں قائم ہوا تھا، روسی علمی مجلس سے اس کا الحاق کر دیا گیا تھا۔ یہ عجائب گھر دنیا کے عظیم ترین عجائب گھروں میں سے ایک ہے۔

روسی جامعات میں ۱۸۰۴ء میں ایک حکم (decree) کے بعد علوم شرقیہ کی تدریس انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوئی، جب کہ مشرقی زبانوں، علوم اور مذاہب کے لیے جامعہ ماسکو، قازان، خارکوف اور بطرسبورغ میں تدریسی شعبے قائم کیے گئے۔ ۱۸۲۳ء میں بطرسبورغ میں علوم شرقیہ اور ڈپلومیٹک مشن کے لیے عہدے دار تیار کرنے کی غرض سے وزارت خارجہ کے تحت ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۸۵۴ء میں ماسکو میں لازاریف اکاڈیمی اسی غرض کے تحت قائم کی گئی تھی، جس میں عربی کے لیے ایک شعبہ مختص تھا، جس پر مصر اور شام کے اساتذہ یکے بعد دیگرے کام کرتے رہے تھے۔

اس طرح ابتدا میں روسیوں کے نزدیک استشراق میں دلچسپی سیاسی اغراض کی بنیاد پر پیدا ہوئی، پھر اس کے بعد اس میں دینی پہلو بھی شامل ہوا، انیسویں صدی کے آخر تک روس میں کوئی بڑا اہم اور قابل ذکر مستشرق نہیں ہوا۔

استشراق کے ارتقا کے عوامل

تاریخ استشراق کا جائزہ یہ بتایا ہے کہ یورپ کا مشرقی زبانوں میں دلچسپی لینا دینی مقاصد

کی بنا پر تھا یعنی اولاً مسلمانوں کے عقائد کی تردید کرنا۔ ثانیاً مسلمانوں، یہودیوں، چینیوں اور ہندوؤں وغیرہ میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا اور ثالثاً مقدس کتابوں کی تلاوت اپنی اصلی زبان میں کرنا اور اس کی تفسیر وتشریح میں عربی زبان کی مدد لینا۔

مرور زمانہ کے ساتھ یہ دینی جذبہ گم پڑ گیا بلکہ بعض اوقات تو نظر سے بالکل اوجھل ہوگیا، جس کا اکثر مستشرقین انکار کرتے ہیں اور بعض اُس کی طرف سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اکثر یورپی اور امریکی مستشرقین نے اپنی علمی سرگرمیاں مذہبی تعلیم سے شروع کی ہیں۔ ان میں سے بعض مذہبی اور تبلیغی امور انجام دینے کی بنا پر وظیفہ بھی حاصل کرتے رہے ہیں اور یہ کہ ان میں سے بعض موجودہ زمانے تک اپنے دینی تعصب کی بنا پر ہی جانے پہچانے جاتے ہیں۔

بہر حال صرف مذہب ہی علوم شرقیہ کی تعلیم اور توسیع کے لیے محرک نہیں تھا بلکہ استشراق کا ارتقا استعمار کو بار آور کرنے کے جذبے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اپنی سیاسی اور اقتصادی اغراض کو پورا کرنے کے لیے استعماری قوتوں نے اس بات کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی سیاسی اور اقتصادی برتری مشرقی ملکوں پر اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب کہ وہ مشرقی علوم (جو ابتدا میں صرف دینی جذبے پر مبنی تھے) اچھی طرح حاصل کر لیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال کا انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض موظفین کو اس بات کا پابند کرتا نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبان، اس کی تاریخ اور تمدن کو پڑھیں۔ پھر ۱۷۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال قائم کی، جو مستشرقین کی پہلی علمی سوسائٹی تھی، اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ گورنر جنرل مذکور یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی مضبوط بنیاد یہاں کے حالات سے اچھی طرح واقفیت کے بعد قائم ہو سکے گی اور اسی صورت میں اس کے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہو سکیں گے۔

جب ۱۸۲۱ء میں فرانس میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد پڑی تھی تو اس کے قائم کرنے والوں نے اعلان میں کہا تھا کہ اس کی اولین غرض یہ ہے کہ تمام ایسی قیمتی اور ضروری دستاویزوں کو جمع کیا جائے جو مشرق قریب میں سفارتی کارندوں اور پورے ایشیا میں تجارتی

اسکیموں کے لیے ضروری ہیں اور یہ کہ اہم صنعتوں مثلاً اون اور روئی کے بارے میں تمام معلومات مہیا کی جائیں جن کا مشرقی مؤلفوں کی کتابوں سے پتا چل سکے

اقتصادی اور سیاسی استعمار کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس سوسائٹی کی نظر سے یہ بات اوجھل نہیں ہوئی تھی جو اس عہد میں مذہبی مجالس کی ذمہ داری تھی، چنانچہ مشرقی علوم کی تعلیم کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت بھی تھی کہ اس کی وجہ سے تبلیغی کاموں کے لیے راستہ ہموار ہوگا جو مسیحی دین کو فروغ دے سکے گا۔

فرانس میں عربی زبان کی تدریس کا دائرہ الجزائر پر قبضے کے بعد وسیع تر ہوگیا، ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی مستشرقین کی توجہ بربر قبائل، ان کی عادات و اطوار اور رسم و رواج کی طرف اسی وقت سے ہوئی، اس لیے کہ فرانسیسی استعمار کی بنیاد "عرب اور بربر کے درمیان لڑاؤ اور حکومت کرو" کی بنیاد پر قائم تھی۔

جب مشرقی ممالک میں مغربی استعمار مضبوط ہوگیا تو اب استشراق کا بنیادی مقصد اپنے نظریات کی اشاعت ہوگیا، یعنی اصلی باشندوں کے تہذیب یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں اپنی خاص مثالی حیثیت کو اس طرح پیش کرنا کہ مشرق، مغرب سے اپنے طرز زندگی اور طریق فکر میں بنیادی طور پر مختلف ہے اس لیے کہ اس کے مذاہب کا فلسفۂ قدیم ایسے ابدی حقائق ہیں جو تاریخی انقلابات سے مرعوب نہیں ہوتے۔

جب استعمار اور استشراق میں تعلقات اس طرح مربوط اور متصل ہیں تو ضروری ہے کہ ان کثیر اور گہرے مسائل کا جائزہ لیا جائے "مثلاً" یہ کہ مشرق میں استعمار کے مختلف ادوار، صلیبی جنگوں کا دور، دورِ توسیع، دورِ استحکام — میں مستشرقین کے طریقِ درس اور اُن کے مختلف مضامین کو اختیار کرنے کا طریق کار کیا رہا ہے، پھر یہ کہ قومی آزادی کے مطالبوں کے دوران مستشرقین کا رویہ کیا رہا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان مہموں کے متعلق معلومات حاصل کریں جو علمائے استشراق بطور ذمہ داری ادا کرتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ اکثر مستشرقین نہ صرف یہ کہ کسی یونیورسٹی یا کسی علمی مجلس کے اساتذہ یا کسی آثار قدیمہ کے سلسلے میں بھیجے جانے والے وفد کے ارکان کی حیثیت رکھتے بلکہ بعض وزارت خارجہ میں مشیر، اہل کار اور جاسوس تھے، یا پھر اسی طرح کے استعماری اداروں اور

ایجنسیوں میں کام کرنے والے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر تمام تر مستشرقین کی توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ وہ ماضی بعید کے مشرقی لوگوں کی تاریخ دانی کا اہتمام کریں اور موجودہ دور کے مشرقی لوگوں کی ترقی کی تاریخ سے گریز اور ان کی موجودہ ترقی اور تحریک آزادی کی طرف سے سکوت اختیار کریں کیا وجہ ہے کہ وہ پرانی مشرقی تہذیبوں کے محاسن کا ذکر تو کریں لیکن اس کے ان عناصر کے بیان ہی پر اکتفا کریں جو ان کے نزدیک فرسودہ ہیں۔ ان کے صالح عناصر کا ذکر نہ کریں جس کی وجہ سے انسانیت ترقی کی راہ پر گامزن تھی۔

مستشرقین کی علمی بحثیں جدید عرب کی ترقی کے متعلق بہت ہی مختصر اور سطحی ہیں، اس کے برخلاف قدیم عرب کی تاریخ اور اسلامی تاریخ کے متعلق بے انتہا بحثیں ہیں، جو بہت سے مسائل کا احاطہ تو کرتی ہیں لیکن اکثر داخلی خانہ جنگی، مذہبی اختلاف، نزاع کے مختلف مظاہر اور گروہ بندی سے متعلق ہیں۔ ان کی علمی کاوشیں، اقتصادی، اجتماعی، قومی تحریکات اور سیاسی نظام کے انقلابوں سے متعلق بہت کم ہیں۔ ان کا مرکزی نقطہ لغوی مسائل، مذہبی نصوص، بادشاہوں اور امراء کے محلات اور آثار قدیمہ کی خبریں ہیں۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ مستشرقین کی تمام کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ اسلام اور عربی تمدن کی ترقی میں خارجی عوامل ہی کو تلاش کیا جائے۔ اور ان تمام عوامل کا ذکر اختصار سے کیا جائے یا بالکل نہ کیا جائے جو صرف عربوں ہی کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ مستشرقین کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے کہ جب فلسفہ اور علوم عربی کا ماخذ یونان کو قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف مشرق و مغرب کے جوہری فرق کو بیان کرتے ہیں تو اصل میں اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ مشرق جس میں عرب بھی شامل ہے نہ تو قدیم یونان کے معیار کو پہنچ سکا ہے اور نہ موجودہ یورپ کے معیار تک رسائی حاصل کر سکا ہے، جس نے انسانی فکر، علوم کا مفہوم اور فن کی حقیقت کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مشرقی علوم کی ترویج میں دوسرے عوامل کا بھی کافی حصہ ہے۔ مثلاً انیسویں صدی میں علم تاریخ میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی اس لیے ہے کہ مستشرقین کو اس بات کا شدید احساس ہو گیا تھا کہ عوامل تاریخ کے قانون ارتقا کا پتا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس سلسلے میں مشرقی قوموں کی تاریخ کا مقابلہ مغربی قوموں کی تاریخ سے کیا جائے۔ اس میں

شک نہیں کہ بعض مستشرقین نے عرب یا چینی تہذیب کا مطالعہ بہ حیثیت علم اور حقیقت حال سے واقفیت کے لیے کیا ہے۔ لیکن ان جیسے حضرات کی علمی کاوشیں تحریک استشراق کی روش میں تبدیلی نہ لا سکیں۔

مستشرقین کے متعلق ہماری رائے جو بھی ہو، ان کی علمی کاوشوں کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اس بات سے غرض ہے کہ علمی بحث اور تاریخی نقد میں ان کا کیا طریقہ ہے، اپنی کمزوری کا پتا اور اپنے افکار کے صحیح ہونے کا علم اسی وقت چل سکتا ہے جب ہم یہ جان کر سکیں کہ دوسرے ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ عرب کی تاریخ اور اس کے تمدن کا صحیح جائزہ لینے کے لیے ہم مستشرقین کی علمی کاوشوں سے صرف نظر نہیں کر سکتے، اس لیے کہ مستشرقین ہم سے اس بات میں سبقت لے گئے ہیں کہ انھوں نے انیسویں صدی کے شروع میں ہماری تاریخ و تمدن کے اہم مصادر کو شائع کرنا شروع کر دیا اور اس میں پوری کوشش کی کہ علمی تحقیق کا پورا حق ادا ہو۔ اگرچہ مستشرقین کی بحثیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، اسلامی فتوحات، اموی اور عباسی حکمرانوں، صلیبی جنگوں، اسلامی تمدن اور موجودہ اسلامی بیداری سے متعلق آپس میں کافی متضاد ہیں، تاہم ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہر حال میں ان بحثوں سے باخبر رہیں، خواہ اس سے استفادہ مقصد ہو یا ان کی تردید۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تاریخ و تمدن کا مطالعہ اپنے نقطۂ نظر سے کریں تاکہ ہم اس قابل ہوں کہ مستشرقین کی غلطیوں اور ان کے مغالطوں کو پکڑ سکیں، ان کی سازشوں اور طبع آزمائیوں کا جو وہ علمی طریقے سے کرتے رہے ہیں ان کی تردید کر سکیں۔